اب جو آپ کے ساتھ تشریف لائے ہیں تو یہ بھی ہمارے سر کا تاج، دل کا سرور اور آنکھوں کا نور ہیں۔"

بندر نے کہا "میرا نام ہورو ہے اور میں بندروں کے قدیم قبیلے Homunculus سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرا دادا اس علاقے کا سردار تھا اور اس کے بتیس بندریوں سے آٹھ سو بچے تھے جو خدا کے فضل سے سارے صحت مند تھے اور لمبی طبعی عمر پا کر اپنے اپنے بڑھاپے میں فوت ہوئے۔"

اب کی بار مختار صدیقی نے حیران ہو کر کہا "صاحب من! آپ بہت اچھی اردو بولتے ہیں اور آپ کا لب و لہجہ خالص اہل زبان کا سا ہے۔ ہم سے تو باوجود کوشش کے ایسا تلفظ اور ایسا لحن پیدا نہ ہو سکا، حالانکہ ہم بھی آپ کے اسی علاقے کی پیداوار ہیں۔"

ہورو نے کہا "میں ایام جوانی میں گھر والوں سے ناراض ہو کر ڈیرہ دون چلا گیا تھا۔ وہاں کچھ عرصہ آوارہ گردی کرنے کے بعد ڈگشی کے ایک معروف خانوادے کا گھر داماد ہوگیا۔ بیوی میری تنک مزاج تھی۔ اس کے ساتھ گزارا نہ ہو سکا۔ میں اپنے پھول سے دو بچے چھوڑ کر سدھارتھ کی طرح گھر چھوڑ کر متھرا کے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔ یہ زبان کا تحفہ وہاں کے چوبوں، برہمنوں اور کائستھوں کی دین ہے۔ بھلے لوگ تھے اور بھلا زمانہ تھا۔ استاد صاحب اب وہ بات نہیں رہی۔" پھر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سر دیوار کے ساتھ لگا لیا۔

منشی مختار صدیقی نے جنتر منتر تنتر پر بہت سی کتابیں پڑھی تھیں۔ وہ کسی زمانے میں روحانیت کے تجربے بھی کرتا رہا تھا۔ اس نے آنکھ کے اشارے سے ہمیں متنبہ کیا کہ یہ بندر نہیں، کوئی بدروح ہے جو ہمارا راستہ روکنے کے لیے بھیجی گئی ہے اس لیے ہمارا یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ میں چونکہ ایسی سپر نیچرل باتوں پر بالکل اعتقاد نہیں رکھتا تھا اس لیے میں نے وہاں سے ہلنے سے انکار کر دیا اور استاد یوسف ظفر کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔

استاد نے پوچھا "آپ کے کوئی بال بچے — کوئی بیٹے پوتے؟"

"سب چھوڑ گئے بھائی، سب چلے گئے۔" ہورو نے دکھی لہجے میں جواب دیا

"ایک بڑھیا رہ گئی تھی سو پچھلے سال وہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اب میں ہوں اور اس گپھا کا کونہ ہے۔ جس دن موت آئی، چپ چاپ اس بدن سے نکل جاؤں گا اور خدا کا شکر ادا کروں گا۔"

اب مختار صدیقی میں پھر بات کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگیا۔ اس نے اپنی مخصوص مدھم مگر کراری آواز میں پوچھا "جناب کو شعر و سخن سے کوئی دلچسپی، غزل و رباعی سے کوئی شغف؟"

بندر نے پرانی یادیں سمیٹتے ہوئے کہا "متھرا، بندرابن اور آگرے کے بڑے بڑے مشاعروں میں شرکت کی لیکن صرف سننے کی حد تک۔ درختوں کی اونچی ڈالیوں میں بیٹھ کر بڑی بڑی راتیں گزاریں لیکن صرف داد دینے کی حد تک۔ خود بھی کبھی کبھار تک بندی کی لیکن صرف اپنا دل بہلانے کے لیے۔ اشعار میں وزن بھی ہوتا روانی بھی، الفاظ کا دروبست اور ردیف قافیے کا حسن بھی اپنی جگہ موجود ہوتا لیکن شعروں میں تغزل نام کو نہ ہوتا۔ میں نے اپنا کلام کسی کو سنانا مناسب ہی نہ سمجھا۔" پھر وہ منہ اوپر اٹھا کر زور سے ہنسا اور کہنے لگا "کیا بندر اور کیا بندر کی شاعری! کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ — سب کچھ مٹ جائے گا صرف اس کا چرہ باقی رہ جائے گا۔"

یوسف ظفر نے ایک مرتبہ پھر پوچھا "ہورو صاحب! پہلی بات تو یہ کہ آپ نے انسانوں کی زبان کہاں سے سیکھی اور اگر سیکھی ہی سیکھی تو ایسی اچھی کیسے سیکھ لی؟ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ آپ تو بالکل اہل زبان کی طرح کلام کرتے ہیں۔"

ہورو نے "شکریہ" کہہ کر بتانا شروع کیا کہ "انگریزوں کی آمد کے فوراً بعد اس علاقے میں کچھ ایسے لوگ تحقیقی کاموں پر مقرر ہو کر آ گئے تھے جو ہمیں ستاتے تھے اور ہمیں اپنے پرانے گھروں سے نکالتے تھے۔ یہاں کے راجوں کے ساتھ ہمارا اور ہمارے بزرگوں کا صدہا سال کا ساتھ تھا۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی جھگڑا، دنگا فساد یا تکا فضیحتی نہیں ہوئی۔ بھائیوں کی طرح وقت گزرا اور اچھا گزرا۔ لیکن جب انگریز آئے تو اپنے ساتھ گولہ بارود اور توپ تفنگ کے ساتھ ساتھ نظریات کے پشتارے بھی اٹھا لائے۔ ہمیں ان کے نظریات کے ساتھ کوئی کد نہیں تھی لیکن جب انہوں نے اپنے

نظریات کو ہم پر ٹھونسنا شروع کر دیا تو پھر ہم سے رہا نہ گیا۔ ہم ساری بندر جاتی نے دن رات ایک کر کے پہلے اپنی زبان اردو میں دسترس حاصل کی، پھر عملاً ان کی زبان بھی سیکھ لی۔ یہ مجبوری اس لیے پیدا ہوئی کہ ہمیں ان کے ساتھ مباحثوں میں شریک ہونا پڑتا تھا اور ان کے ساتھ لمبے ڈائیلاگ کرنے پڑتے تھے — " پھر وہ ذرا رک کر اور بڈھے آدمیوں والا کھٹا اور لمبا ڈکار لے کر بولا "یہ فرنگی لوگ بحث مباحثے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔ گیان دھیان سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔"

میں نے اس کی سنی ان سنی کر کے کہا "بندر صاحب! آپ کے اور ان کے درمیان وجہ نزاع کیا تھی اور مباحثے اکثر کن موضوعات پر ہوتے تھے؟"

ہورو صاحب نے انگشت شہادت اٹھا کر کہا "ایک اور صرف ایک موضوع پر.... وہ کہتے تھے ہم انسان لوگ بھی پہلے آپ لوگوں کی طرح بندر ہی تھے، پھر ہم نے کچھ اعلیٰ درجے کی ارتقائی منازل طے کر کے خود کو انسانی صورت میں مبدل کر لیا اور تم لوگ بندر کے بندر رہ گئے۔"

مختار صدیقی کہنے لگا "یہ تو ایولیوشن کی پرانی تھیوری ہے اور بالکل ٹھیک اور سو فیصد راست تھیوری ہے۔ اس میں جھگڑے کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں۔"

"مختار صاحب! مختار صاحب" ہورو بندر نے درد بھرے لہجے میں پکار کر کہا "آپ تو یہ بات نہ کہیں خدا کے لیے — آپ تو گیانی لوگوں میں سے ہیں اور اتنے بڑے شاعر ہیں۔"

"اس میں شاعر ہونے یا نہ ہونے کی بات نہیں ہورو صاحب" یوسف ظفر نے سمجھاتے ہوئے کہا "اس تھیوری پر تو زمانے نے اور تاریخ کی گزری ہوئی صدیوں نے اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس میں تو بحث کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی۔"

ضعیف بندر ہمارے خیالات سن کر کچھ مایوس سا ہوگیا اور سر جھٹک کر بولا "آپ بھی اچھے موحد ہیں جو ایسی باتوں کو سچ جان کر روا سمجھتے ہیں۔ یہی باتیں ہم سے ارتقائی گروہ کے سائنس دان کیا کرتے تھے اور انہی لوگوں کو مسکت جواب دے کر ہم ان کے منہ بند کر دیا کرتے تھے۔ اب وہ لوگ مسلسل پراپیگنڈے کے زور پر جیت گئے اور ہماری منطقی اور سائنٹفک دلیلیں ان کے سامنے کمزور پڑ گئیں۔"

"سائنس تو ان کی ہے بادشاہو" میں نے اونچے لہجے میں کہا "پھر آپ کی دلیلیں کدھر سے سائنٹفک ہوگئیں؟"

ہورو نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھ کر کہا "میاں صاحب زادے، ہم بے انصاف نہیں ہیں۔ جو کام سائنس نے کر دکھایا، اس کی تعریف کرتے ہیں لیکن جہاں وہ دلیل کی پٹڑی سے اتری وہاں ہم نے اس کا گلا دبوچا۔ ہم بندر لوگ ہیں، کوئی مولوی یا پادری نہیں کہ ضد میں آ کر اپنی ہی ہانکتے جائیں۔ ہم دلیل سے بات کرتے ہیں اور دلیل و برہان سے اس کا جواب چاہتے ہیں۔"

مختار صدیقی ذرا سا آگے جھک کر بندر کی بات سننے لگا۔

ہورو نے کہا "سب سے پہلے تو ارتقا کے بابا آدم نے نا سائنسی بات کی کہ اگر..."

"چارلس ڈارون نے؟" یوسف ظفر نے کہا۔

"ناں جی ناں" ہورو نے بے زاری سے کہا "اس کے دادے نے۔"

"ارسمس ڈارون نے!" مختار صدیقی نے جلدی سے کہا۔

"جی جناب" ہورو کہنے لگا "اس نے اور اس کے ایک فرانسیسی ساتھی نے پولیس والوں کی طرح ایک قاعدہ کلیہ ہی قائم کر لیا کہ جانوروں کے اختصاص اور ان کی صفات اکتسابی ہوتی ہیں — جیسے سورج کی مسلسل حدت سے جانوروں کی رنگت پیلی پڑ گئی، بدن سختیاں سہتے سہتے اور چوٹیں کھاتے کھاتے موٹی اور بھدی کھال کے حامل ہوگئے، اونٹوں کے دوزانو ہوکر جھکنے اور دوزانوں کا سہارا لے کر اٹھنے سے ان کے گوڈوں پر پیڈ پیدا ہو گئے — یہ — اور اسی طرح کی بے شمار باتیں پنڈت پانڈے اور بسیار گوز ٹلی تو کہہ سکتے ہیں لیکن ایک سائنس دان کو زیب نہیں دیتیں۔"

"لیکن انہوں نے اس کے ثبوت بھی تو فراہم کر کے دکھائے۔" میں نے قدرے غصے سے کہا۔

"کوئی ثبوت نہیں میاں صاحب زادے" ہورو سنجیدگی سے بولا "یہ سب اندازے اور ٹیوے ہیں۔ سائنس دان بھی انکل پچو کی سیڑھی پر سوار ہو کر بہت اوپر نکل جاتے ہیں۔ نہ صرف خود نکلتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اکھاڑ دیتے ہیں۔" ہورو بڑی

کمینہ طنز کے ساتھ ہنسا اور پھر نفی میں سر ہلانے لگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح چھوٹے بخاری صاحب بڑے بڑے باتوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے "ودی ودی" کہہ کر سر ہلایا کرتے تھے۔

مختار صدیقی آنکھیں جھپکے بغیر بندر کے سامنے اپنی ذہانت کا پھن اٹھائے کھڑا تھا مگر اس کے کندھے اندر کو جھک کر علم کی بھیک سمیٹنے کو بڑا سا کشکول بن گئے تھے۔ سائنس اور سائنس دانوں کے خلاف ہورو کی کھلی اور بے حیائی کی گفتگو مجھ سے برداشت نہ ہو سکی اور میں منہ موڑ کر دوسری طرف کی شاخوں اور پتوں کو دیکھنے لگا۔

ہورو کہہ رہا تھا "صاحبان من! ایک لمحے کے لیے مشاہدے کی آنکھیں کھول کر، علم کا ہاتھ بصیرت کے سینے پر رکھیے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ ارتقا کی تھیوری کس حد تک سائنٹفک تھیوری ہے۔ ارتقا کے علم بردار زندگی کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک تو زندگی اپنے آپ کو تکثیر کرنے کی قوت رکھتی ہے یعنی اپنی جیسی، عین مین اپنی جیسی، ایک اور زندہ شے پیدا کر سکتی ہے۔ دوسرے اپنے ماحول اور باہر کے محرکات سے متاثر ہوتی ہے اور تیسرے یہ کہ زندگی بڑھتی ہے، پھلتی پھولتی ہے اور اس کی نشوونما ہوتی رہتی ہے۔"

"اور یہ تینوں خصوصیات ایسی ہیں" میں نے اونچی آواز میں کہا "کہ سوائے زندگی کے، ان کا تسلسل اس انداز میں اور کہیں نہیں ملتا۔"

"بس اسی غلط فہمی کے وہ بھی مارے ہوئے تھے۔" بزرگ بندر نے پرانی یادوں کو ٹٹولتے ہوئے کہا "ڈارون اور اس کے ساتھی سائنس دان ڈارون کی زندگی میں بھی حیات کی یہی تعریف کرتے تھے اور اس کے بعد بھی طالب علموں کو یہی پڑھاتے رہے۔"

استاد یوسف ظفر نے بڑی استقامت کے ساتھ میرا اور میرے علاوہ مختار صدیقی کا ساتھ دیتے ہوئے بلکہ اپنی روشن اور چمک دار آنکھوں کی وساطت سے ساری مہذب اور کل تعلیم یافتہ دنیا کا ساتھ دیتے ہوئے کہا "ہورو صاحب! یہ تو حیات کی ایک طے شدہ ڈیفی نیشن ہے، جسے کل دنیا تسلیم کر چکی ہے۔ ہر ملک کی ہر قوم اپنی اپنی زبان اور اپنے اپنے نصاب میں اسے درج کر چکی ہے۔ اس پر تو کوئی دو رائیں ہو ہی

نہیں سکتیں۔"

بزرگ بندر نے غور سے یوسف ظفر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "استاد یوسف ظفر آپ تو صاحب نظر شاعر ہیں، پھر آپ کس طرح سے ان لوگوں کے بہلاوے میں آگئے جو حیات کی ڈیفی نیشن ان تین نکات کی بنا پر کرتے ہیں!"

مختار صدیقی بالکل خاموش، ساکت و صامت کھڑا تھا اور اپنے پرانے خیالات کی کریز کرتے ہوئے اندر سے نیا حوصلہ نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہورو نے کہا "مختار صدیقی صاحب! اگر زندگی کی بنیادی ڈیفی نیشن یہ ہے کہ وہ اپنے جیسی ایک اور زندگی تخلیق کر سکتی ہے تو پھر شعلے کے بارے میں کیا خیال ہے جو ایک مرتبہ بھڑک اٹھتا ہے تو پھر اس سے کئی شعلے اور پیدا ہونے لگتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے سارا جنگل اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ آپ انسانوں نے تو جنگل کو کبھی اتنے قریب سے دیکھا نہیں اور نہ ہی اس کے اندر لپکنے، بھڑکنے اور پھیلنے والی آگ کا اندازہ کیا ہے۔ ہم نے اپنے خاندانوں کے خاندان اور گروہوں کے گروہ جنگلوں کی آگ کو بھینٹ کیے ہیں — ہم جانتے ہیں کہ شعلے سے شعلہ کس طرح جنم لیتا ہے اور آگ سے آگ کیسے جنم لیتی ہے لیکن ہم اس کو زندگی تو نہیں کہتے، اس کو حیات تو نہیں تسلیم کرتے حالانکہ شعلے سے شعلہ اور چنگاری سے جنم لینے والی چنگاری ارتقا والوں کی حیاتیاتی ڈیفی نیشن پر بالکل پوری اترتی ہے۔"

یوسف ظفر نے چلا کر کہا "بس بس! زندگی اور زیست کو مرگ اور ممات کے مماثل سے واضح نہ کیجئے۔ کونپل سے پھوٹتی ہوئی کونپل کو شعلہ نہ بنائیے۔"

بزرگ بندر نے غور سے یوسف ظفر کی طرف دیکھا اور بڑے سبھاؤ کے ساتھ کہا "نہیں صاحب من! نہیں۔ ہم کیوں ہلاکت و ممات کی بات کریں اور انتقال و وفات کا ذکر کریں۔ کیوں نہ تعمیر و تسلسل کی مثال سے واضح کریں کہ مصری میں جب کرسٹل بنتا ہے تو ایک شاخ نبات سے دوسری شاخ پیدا ہوتی ہے۔ عطار شیرے میں بتی ڈال کر ڈھیروں ڈھیر کرسٹل مصری کے بنا لیتا ہے — لیکن اسے آپ زندگی کا عمل یا زندگی کی نشانی نہیں کہہ سکتے۔" پھر وہ ہنسا اور کہنے لگا "چلئے آپ کی اس قدر تشفی تو ہوگئی کہ بوڑھا بندر شعلہ جوالا سے نکل کر لعل لب شکر خارا تک پہنچ گیا۔ اب کسی روز

ابتدائے آفرینش کے گریختہ آہو کو بھی پکڑ لائے گا۔"

"یہ تو آپ نے درست فرمایا" مختار صدیقی نے نہایت ادب سے عرض کیا "لیکن زندگی کی یہ یکتا خصوصیت کہ وہ اپنے گرد و پیش سے، اپنے ماحول سے اور اپنے محرک سے اثر پذیر ہوتی ہے — اس پر آپ نے غور نہیں کیا۔"

ہورو نے پرانے بے تکلف دوست کے انداز میں کہا "مختار جی! آپ تو شاعر ہیں اور بڑے گہرے جذبوں کے شاعر ہیں۔ ماحول اور محرک کے اثرات تو بلبلے پر بھی اثرانداز ہوتے ہیں، بنتا بھی ماحول کے دباؤ سے ہے اور ٹوٹتا بھی اسی کی تحریک پر ہے۔ کیا آپ اسے زندہ اشیاء کی فہرست میں رکھیں گے؟ اسے ایک جاندار سمجھ کر اس سے تخاطب کریں گے؟" پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور فضا میں دیکھتے ہوئے کہا "ہماری ان سے بڑی بحثیں ہو چکی ہیں سر، ان ارتقائی سائنس دانوں سے — لیکن وہ زور آور لوگ ہیں، حکومتوں والے ہیں، انعاموں والے ہیں، طاقت والے ہیں۔ سارا میڈیا ان کے ساتھ ہے۔ دنیا بھر کی افسر شاہی، فوج سپاہی، عسکر لشکر ان کے ساتھ ہیں۔ وہ ہماری بات کیوں مانیں گے بھلا! بس چپ ہی رہنے دیجئے۔"

میں نے کہا "معاف کیجئے، آپ کچھ زیادہ ہی ضدی بندر ہیں جو سائنس کی اتنی بڑی تھیوری کو اس قدر آسانی سے جھٹلا رہے ہیں۔"

میری اس بات پر وہ تڑپا اور دونوں ہاتھوں سے زور کی تالی بجا کر بولا "نہ میرے سوہنا! نہ میرے راجا۔ ہم اس تھیوری کو یا کسی بھی تھیوری کو جھٹلاتے نہیں ہیں، ہم تو اس پر فنی اور منطقی گفتگو کرتے ہیں اور پھر یہ تو ایک تھیوری بھی نہیں ہے — ایک پیراڈائم ہے، ایک مفروضہ اور ایک اندازہ ہے۔ ابھی تو اسے تھیوری بننے میں کئی چومکھی لڑائیاں لڑنی پڑیں گی۔"

مختار صدیقی ابھی تک دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، جیسے سکول کے بچے صبح سویرے دعا گاتے وقت باندھا کرتے ہیں، چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا "سر اپنے جیسے ہم جنسوں کے باہمی اختلاط سے زندگی میں پھیلنے کی ایسی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی گروتھ کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا۔ یہی اس کی بین نشانی ہے۔ حتیٰ کہ اس سلسلے میں آپ نظر نہ آنے والی مخلوق بیکٹیریا ہی کو لے لیں، وہ بھی ایک

دوسرے کے تل میل سے اور ایک دوسرے کے انگ سے انگ ملا کر اس قدر تیزی کے ساتھ بڑھتا ہے کہ اس کی پیداوار کو روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔"

بزرگ بندر نے بڑے آرام سے کہا "منشی جی! وائرس اس سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھتا ہے لیکن اس کی گروتھ زندگی کے طے شدہ اصول کے مطابق نہیں ہوتی۔ نہ تو اس کے اندر سے کچھ پیدا ہو کر اس میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور نہ ہی وائرس کسی دوسرے وائرس کے انگ سے انگ ملا کر اپنی پیداوار میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن جب بڑھنے پر آتا ہے تو اللہ توبہ! اس کی تیز رفتاری کے سامنے ساری پرانی کلاسیکی مخلوق کا عمل توالد و تناسل چھوئی موئی بن جاتا ہے۔"

میں نے اور یوسف ظفر نے حیرانی سے ہورو کو دیکھا تو وہ ہماری کم علمی کا اندازہ لگا کر کہنے لگا "وائرس اپنی آبادی میں دوسرے جانداروں کی طرح اضافہ نہیں کرتا۔ اس کے پاس ایک اور ہتھیار ہے۔ وہ کسی ایک جرثومے کو مغلوب کر کے اس کے بائیو کیمیکل اجزاء کو خود اپنا لیتا ہے اور پھر وہاں بیگانی ہتھی گھما گھما کر اپنی پیداوار میں اضافہ شروع کر دیتا ہے۔ بس پھر چل سو چل۔ اس کی پیداوار کے سامنے تو سمندر بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔"

میں نے اس سے کچھ اور پوچھنا چاہا تو مختار صدیقی نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا کہ اس بزرگ بندر کے سامنے ہمارا جو بھی سوال ہوگا وہ احمقانہ اور طفلانہ ہوگا۔

ہورو نے منشی کا رویہ قدرے سخت جان کر مجھ سے کہا "میاں برخوردار! یہاں بہت بڑے بین الاقوامی مباحثے، مناظرے اور مباہلے ہوتے رہے ہیں اور دنیا بھر کے عظیم ترین سائنس دان ادھر تشریف لا کر ہم سے گفتگو کرتے رہے ہیں لیکن ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان بندر سے بنا ہے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ بہت سے انسان خدا کے حکم سے مجبور ہو کر بندر ضرور بنے ہیں لیکن وہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔ ہم کہتے ہیں کہ بات تم بھی ٹھیک کرتے ہو لیکن الٹے ہاتھ کی کرتے ہو۔ تم سیدھے سبھاؤ اپنی شکل نہیں دیکھتے ہو، آئینے میں دیکھ کر بولتے ہو اور آئینے کی شکل ہمیشہ الٹ جاتی ہے۔ دایاں بایاں ہو جاتا ہے اور بایاں دایاں۔ لیکن ہماری یہ بات منطقی یا

سائنٹفک نہیں ہے، محض ان کو زچ کرنے کی ہے کہ انہوں نے اپنی حماقت اور بے علمی سے ہم کو بھی بہت ملول و بے زار کیا ہے۔"

منشی مختار صدیقی نے کہا "حضور! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی کہ انسان کس طرح بندر بن گئے؟"

ہورو نے کہا "کیا یہ بات سمجھ میں آ گئی ہے کہ بندر کس طرح سے انسان بن گئے؟"

میں نے کہا "جناب عالی یہ بات نہ صرف سمجھ میں آ گئی ہے بلکہ سائنس دانوں نے پایہ ثبوت تک پہنچا دی ہے۔"

مختار صدیقی نے کہا "ٹھہر جا یار، پہلے ان کی بات سننے دے۔"

بزرگ بندر نے کہا "جب کسی شے میں کمتری اور گھٹاؤ پیدا ہونے لگتا ہے اور اس کے "ہونے" میں نقدان کی پھپھوندی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر اس شے کی قدر و قیمت کم ہونے لگتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد آپ نے دیکھا کہ دنیا کی بیشتر کرنسیاں گھاٹے ٹوٹے کا شکار ہوگئیں۔ کچھ کرنسیاں تو ایسی ڈی ویلیو ہوئیں کہ ان کا روپیہ ایک پیسے کا ہوگیا۔ یہی حال انسان کا ہے — جب تک کھرا رہتا ہے، اشرف المخلوقات ہے اور اس کی ٹنکار دور تک سنائی دیتی ہے لیکن جب ڈی ویلیو ہو جاتا ہے تو پھر اسفل السافلین کے گرداب میں پھنس جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ ان ڈی ویلیوڈ انسانوں کے ساتھ ہوا۔ خدا نے حکم دیا کہ چلو بندر بن جاؤ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ چنانچہ اچھے بھلے انسان تھے اور دیکھتے دیکھتے بندر بن گئے۔ خود میرے ننھیال کا ایک بہت بڑا گھرانہ بندر بن گیا تھا۔ عاد و ثمود کے زمانے میں وہ ایک لمبا سفر طے کر کے کوہ شوالک کے دروں میں آباد ہوگئے تھے۔"

"آپ کو کس نے بتایا؟" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا تو اس نے ہنس کر کہا "او بھئی ہمارے پڑنانا کے پاس پورا شجرہ نسب تھا اس گھرانے کا۔ سب کے نام اور رتبے درج تھے اس میں۔ میرے ننھیال تو چونکہ بیشتر بندر بن گئے تھے اس لیے وہ تو اپنے شجرہ نسب کو پڑھ نہیں سکتے تھے لیکن جو ابھی انسانی صورت میں رہ گئے تھے، وہ پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔"

"لیکن آپ کو اس شجرہ نسب کا علم کیسے ہوا، آپ تو بندر تھے؟" میں نے نکتہ
"آپ تو وہ دستاویز پڑھنے سے قاصر تھے۔"

"وہ تو ہم اب بھی ہیں اشفاق میاں۔" ہورو نے بزرگوں کی سی رواداری سے جواب دیا "اس کا اعتراف ہم ہمیشہ کرتے رہیں گے کہ ہم پڑھنے لکھنے سے قاصر ہیں اور تحریر کو اٹھا نہیں سکتے۔ وہ سائنس دان جن سے پوری نصف صدی تک ہمارے مباحثے ہوتے رہے، وہ البتہ ہر قسم کی زبان پڑھ سکتے تھے۔ انہوں نے ہمارے پرکھوں کے نسب نامے دیکھ کر اس بات کی تصدیق کی کہ واقعی ہمارے بزرگ پہلے انسان ہوتے تھے اور عاد و ثمود کی بڑی بڑی سلطنتوں کے آس پاس ان کی بھی راج دھانیاں تھیں۔"

"لیکن انہوں نے کیا کیا تھا؟" میں نے پوچھا "ان افعال کی تفصیلات کہیں نہیں ملتیں۔ نہ ہی یہ پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مخصوص غلطی کیا کی تھی اور ان کا صریحاً کیا گناہ تھا۔"

"جہاں تک ہمیں معلوم ہے" ہورو نے کہا "انہوں نے حیوانوں کے افعال اختیار کر لیے تھے اور جب خدا کے نبی اور رسول انہیں ایسی حرکتوں سے منع کرتے تھے تو وہ اکثر یہ دلیل دیا کرتے تھے کہ جب حیوان اور دوسرے چرند پرند ہر طرح کا عمل کرنے میں آزاد ہیں تو پھر انسانوں پر پابندی کیوں؟ ہم بھی تو انہی کی طرح کی ایک مخلوق ہیں اور ہمیں بھی تو اللہ نے بنایا ہے۔ ہم سب وہی کچھ کرنا چاہیں گے جو دوسرے جاندار اور حیوان کرتے ہیں۔ ہم بھی ان کی طرح آزاد اور مبرا اور معرا رہنا چاہیں گے کہ ہم کسی بھی صورت میں ان سے کم نہیں ہیں — چنانچہ حکم ہوا کہ جاؤ بندر اور سور بن جاؤ — اور حکم کی تعمیل ہوئی!"

منشی مختار صدیقی بجائے اس کے کہ ہورو سے کوئی فلسفیانہ بات کرتا یا اس کو اپنے علم کی مار دیتا، خود اسی کا ساتھی سا بن کر کھڑا ہوگیا تھا۔ بڑے ادب سے پوچھنے لگا "آپ کے یہ مباحثے اور ارتقائی سائنس دانوں کے ساتھ سیمینار، کانفرنسیں اور اجتماعات یہاں کیوں ہوتے رہے اور اس مقام کو کیوں منتخب کیا جاتا رہا حالانکہ میرے حساب سے کرہ ارض پر یہ علاقہ کوئی ایسا اہم مقام نہیں ہے؟" پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے باہر کے پہاڑوں کا نظارہ کرتے ہوئے کہا "نہ تو یہ بندروں کی آبادیوں کا کوئی صدر مقام

ہے نہ اس کی کوئی تاریخی اہمیت ہے، نہ یہاں علم و عمل اور تحقیق و تفتیش کی کوئی روایت موجود ہے۔ پھر آپ لوگوں کی کانفرنسیں یہاں کیوں ہوتی رہیں؟"

بزرگ بندر نے آنکھیں موند کے، تھوتھنی اوپر اٹھا کر مٹھار کے کہا "منشی جی یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے مباحث آفرینش سے اور زندگی کی ابتدا اور اس کے چلن سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کو اسی مقام پر واقع ہونا تھا کہ یہی وہ متبرک مقام تھا جہاں ایسی کانفرنسوں کا تقدس برقرار رہ سکتا تھا۔"

"گویا مقام کی نشان دہی آپ نے کی؟" یوسف ظفر نے پوچھا۔

"جی جناب! مقام کی نشان دہی ہم نے کی اور مباحث کے مقام کا تعین ہماری طرف سے کیا گیا۔"

"مگر کیوں؟" میں نے فرسٹ ایئر کے ایک جوشیلے طالب علم کی طرح پوچھا "کس لیے آپ لوگوں نے یہ جگہ منتخب کی؟"

"اس لیے میاں صاحب زادے!" ہورو نے اطمینان سے جواب دیا "کہ یہ جگہ پاکیزہ ہے اور اس کا ایک عظیم پیدائش کی برکت کے ساتھ تعلق ہے۔"

ہم تینوں بالکل خاموش کھڑے تھے اور ہورو کہہ رہا تھا "ابتدائے آفرینش کے معاملے میں ہمارے مخالف اور مدمقابل — کہ جن کا ہم دل سے احترام کرتے ہیں — چاہے کچھ بھی کہہ لیں جب تک ان تین حقیقتوں کو اچھی طرح سے نہیں سمجھ لیں گے، ان کی تحقیق کے راستے بند رہیں گے۔ اول تو یہ کہ زندگی کی ابتدا اور پیدائش کا عمل ماں باپ کے بغیر بھی ہو سکتا ہے جیسے حضرت آدم کی پیدائش، پھر یہ کہ پیدائش کا عمل بغیر ماں کے بھی ہو سکتا ہے جیسے حضرت حوا کی پیدائش اور آخر میں یہ کہ پیدائش بغیر باپ کے بھی ہو سکتی ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش —"

یہ بات کہتے ہوئے بزرگ بندر نے اپنی پوری آنکھیں کھولیں۔ ہم تینوں کو ایک ایک کر کے دیکھا اور پھر دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ کر بولا "یہ پہاڑ اسی محترم و مقتدر ہستی اور پاک نہاد و پاک باز خاتون حضرت بی بی مریم کا مدفن ہے۔"

ہم تینوں کی ایک ساتھ چیخ نکل گئی!

ہورو نے کہا "حضرت عیسیٰ" کے مقام معلیٰ پر پہنچ جانے کے بعد حضرت مریم کا

بیت اللحم میں رہنا مشکل ہوگیا اور وہ دور دراز کے سفر کرتی اس مقام پر پہنچ گئیں۔ یہاں کے لوگوں نے ایک نیک اور پاک باز ہستی کا استقبال عقیدت کے دل پر ہاتھ رکھ کے کیا اور جب تک وہ ان لوگوں کے درمیان رہیں — بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کی عقیدت کا مرکز بن کر رہیں۔ لوگ انہیں ان کے عبرانی نام کے حوالے سے مائی "ماری" کہہ کر پکارتے تھے اور ان کی طرف پیٹھ کر کے نہیں چلتے تھے۔ جب وہ فوت ہوئیں اور انہیں ان کے عقیدے کے مطابق یہاں دفن کیا گیا تو اس علاقے کے لوگوں نے اپنے پہاڑ کا نام مائی ماری کا پہاڑ رکھ لیا۔ بعد کے آنے والے اسے ماری کے پہاڑ کے بجائے مری کا پہاڑ کہنے لگے اور ڈاک خانے والوں نے اپنی سہولت کے لیے اسے کوہ مری کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔"

ہم تینوں میں سے کسی کو بھی کچھ پوچھنے کا یارا نہ تھا۔ یہ الگ باب بلکہ ایک الگ کتاب تھی اور ہم اس کتاب کو اس وقت نہیں کھول سکتے تھے۔

ہورو نے کہا "مائی ماری صاحب کا مدفن ہمارے بزرگوں کو معلوم تھا لیکن بعد کی آنے والی نسلوں نے اپنی خراباتیوں میں گم ہو کر اس کو فراموش کر دیا۔ بدھ مت کی پرانی کتابوں میں البتہ یہ بات صراحت سے لکھی ہے کہ "ہماری دانش گاہ ٹیکسلا سے تھوڑی ہی دور مائی ماری صاحب کا مزار ہے جو ایک جلیل القدر پیغمبر کی بہت ہی برگزیدہ والدہ تھیں۔"

ہورو کے پاس بات کرنے کا ایک دل نواز ڈھنگ تھا۔ وہ صرف زبان ہی سے بات نہیں کرتا تھا بلکہ آنکھوں سے، ہاتھوں سے، سانسوں سے اور خاموشیوں سے بھی گفتگو کرتا تھا۔ گفتگو کے دوران جب وہ اچانک کسی مقام پر رک جاتا تو اس کی بات اور بھی بامعنی ہو جاتی۔ اس نے سر جھکا کر اپنے آپ سے کہا "چونکہ سائنس دانوں کے ساتھ ہمارا جھگڑا ابتدائے آفرینش سے تعلق رکھتا تھا اس لیے ہم نے اپنی کانفرنسوں اور میٹنگوں کے لیے ایک پاک مگر عجوبہ آفرینش کے اس ذریعے کو اپنایا جسے اللہ کریم نے خاص طور پر منتخب فرمایا تھا۔ اسی ہستی نے جب اس پہاڑی مقام پر اپنا مبارک قدم رکھا تو ہماری جاتی نے یہی فیصلہ کیا کہ جو کانفرنس ہوگی، وہ اسی مقام پر ہوگی اور جو ڈایلاگ ہوں گے، وہ اسی علاقے کے اندر رہ کر ہوں گے۔"

اس بزرگ بندر کی یہ دلیل مختار صدیقی اور یوسف ظفر کے لیے تو کافی ہو سکتی تھی لیکن میں اس کے بالکل خلاف تھا اور ہورو کے ساتھ بحث کرنے کے لیے تیار تھا کہ حضرت مریمؑ نے نہ تو کبھی ادھر کا سفر کیا اور نہ اپنی زندگی کے آخری ایام مری کے سلسلہ ہائے کوہ میں بسر کیے۔ گو میرے پاس بھی اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل نہ تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ لوگ اس معاملے میں میرا ہی ساتھ دیں گے اور میں ہی ہر حال میں کامیاب ٹھہروں گا۔ لوگ دلیل سے بات نہیں کرتے، اپنی پسند ناپسند سے کرتے ہیں!

استاد یوسف اب کچھ تھک سا گیا تھا اور تھکاوٹ سے اس کے چہرے پر تکدر کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے بدن کو زور لگا کر سیدھا کرتے ہوئے کہا "جناب والا! پھر آپ کی کانفرنسوں کا نمک مکا کیا ہوا، اور آپ کے متفقہ اعلامیہ میں کیا بات طے پائی کہ ارتقائی تھیوری صحیح ہے یا ابھی اس میں کچھ اسقام باقی ہیں؟"

ہورو نے کہا "استاد جی ایسی باتوں کے کوئی حتمی فیصلے تو ہوتے نہیں، ہر کوئی اپنی اپنی ضد پر قائم رہتا ہے۔ بات چلتی چلتی ابتدائے آفرینش پر آ کر رک گئی۔ یہ سن پینتیس کی بات ہے۔"

"ارتقا پر جب بھی بات ہوگی" استاد یوسف ظفر نے کہا "ابتدائے آفرینش کا لازمہ ہر حال میں آئے گا۔"

ہورو نے کہا "اس زمانے میں کوئٹہ میں بڑا زبردست زلزلہ آیا تھا۔ جو بچ رہے تھے، وہ اپنے اپنے گھر چھوڑ کر عزیزوں رشتہ داروں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ادھر بھی بہت سے لوگ آئے۔ ہماری ان دنوں ایک بڑی عالمی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں ہماری جاتی کے لوگوں نے یہ پھڈا ڈالا ہوا تھا کہ اگر بقائے اصلح یعنی سروائیول آف دی فٹیسٹ ہی ارتقائی تھیوری کی بنیاد ہے تو پھر اس کرہ ارض کے اعلیٰ ترین اور ارفع ترین اور طاقت ور ترین شیر تو اس دنیا میں کم ہو رہے ہیں اور ناکارہ و نحیف ہرنیوں کی لرزاں و افتاں ڈاریں موج در موج بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس دنیا میں عقاب اور شاہین تو کیوں ہے اور سروائیول آف دی فٹیسٹ والا "فٹیسٹ" ناطاقت و ناستوار کیوں ہو رہا

ہے؟ ان سے کوئی جواب تو نہ بن پڑا البتہ انہوں نے کوئٹہ کے زلزلے کا عذر پیش کر کے کانفرنس ختم کر دی۔"

یوسف ظفر نے کہا "لیکن آپ تو ابتدائے آفرینش کی بات کر رہے تھے کہ ارتقائی تھیوری کا گہرا تعلق "اوریجن آف لائف" سے ہے۔"

"وہ تو ہے" ہورو نے تیقن کے ساتھ کہا "اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن اس کائنات میں لائف کی ابتدا کس طرح سے ہوئی، یہ ایک مشکل مسئلہ ہے جو سائنس دانوں کے لیے بہت ہی پیچیدہ وائرس بن کر ان کے وجود سے چمٹ گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ گذشتہ پچاس سال سے ان کی مشکل کچھ کم ہو گئی ہے اور انہوں نے ایک نئی تھیوری قائم کر کے اپنی جان ایک بڑے مخمصے سے نکال لی ہے کہ یہ کائنات ایک بڑے دھماکے سے معرض وجود میں آئی ہے اور اس دھماکے کے بعد کائنات کے ہر شعبے نے خود بخود کام شروع کر دیا ہے۔"

"تو آپ کو اس پر کیا اعتراض تھا؟" مختار صدیقی نے حیرانی سے پوچھا۔

ہورو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا "حاشا و کلا ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور نہ ہی ہم نے ان کے ساتھ اس پر کسی قسم کی بحث کی تھی — ہمارے بڑے صرف اتنی بات کہتے تھے کہ پیارے انسانو! تم اتنی بات کیوں نہیں مان لیتے کہ خالق کائنات نے "کن" کہا تو ہو گیا! اور جب وہ "کن" کہتا ہے تو ہونے والی شے فوراً ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کائنات "نہ ہونے" سے "ہونے" میں آ گئی اور لامعلوم سے معلوم میں داخل ہو گئی۔ لیکن وہ یہ بات نہیں مانے اور اسی تھیوری پر اڑے رہے کہ بس ایک بڑا سا دھماکہ ہوا، زور کا پٹاخہ چلا اور کائنات وجود میں آ گئی۔ یہی کہتے رہے کہ دھماکہ ہوا لیکن دھماکہ کرنے والا کوئی نہیں تھا — پٹاخہ ضرور ہوا لیکن رنگ ماسٹر کوئی نہیں تھا، سانٹے والا موجود نہیں تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ ہی کی بات ٹھیک ہے لیکن اس میں تھوڑی سی ترمیم کر لیجئے۔"

"وہ کیا؟" میں نے ذرا غصے سے پوچھا؟"

"وہ یہ اشفاق صاحب" ہورو نے اپنی بڈھی آنکھیں پورے زور سے کھول کر کہا "کہ اُس دھماکے کی ابتدا سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ خدا نے "کن" کہا اور ایک زور کا

دھماکہ ہوا... ایک بگ بینگ ہوا اور یہ کائنات معرض وجود میں آ گئی۔ سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ کسی نے چلایا نہیں، پٹاخہ خود بخود چل گیا ـــ بس ہمارے اور ان کے درمیان یہی بنیادی جھگڑا تھا۔ جب بھی تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔"

جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو بزرگ بندر کچھ کھسیانا، کچھ ملول اور کسی حد تک دل برداشتہ ہو کر بولا "کوئی لڑکا بالا ہوتا تو اسے درختوں پر چڑھا کر آپ کے لیے املوک یا اخروٹ وغیرہ اترواتا۔ آگے بادام کا ایک درخت ہے۔ اس کے کچے بادام بڑے ہی لذیذ اور دودھیا ہیں۔ لیکن اب یہاں کوئی ہے ہی نہیں اور میری اتنی جان نہیں کہ لپک کر خود درخت پر چڑھ سکوں ـــ بس اب ایسے ہی ہے۔"

مختار صدیقی نے دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر اسے یقین دلایا کہ آپ مطمئن رہیے اور خاطر جمع رکھیے اور ان تکلفات میں پڑنے کی زحمت نہ کیجئے۔ آپ کی صحبت سے ہم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ شاید ہم نصف صدی کے مطالعے سے بھی حاصل نہ کر سکتے ـــ آپ کا بہت بہت شکریہ ـــ بڑی مہربانی۔ خدا آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ ابھی کچھ اور وقت ہمارے درمیان آباد رکھے!

جب ہم تینوں نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ایک ساتھ سلام کیا اور اس سے رخصت چاہی تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ پوری کوشش کے باوصف وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا۔ ہماری طرف چہرہ کیے بغیر اس نے اپنی روتکھی مگر زوردار آواز میں کہا "اس کرہ ارض کے سارے بندر بڑے کرب میں مبتلا ہیں اور رنجوری کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اندر ہی اندر ان سب کو اس نئی اساطیر سازی پر یقین ہو گیا ہے کہ جس طرح ان کے آباؤ اجداد ارتقا کے زور پر بندر سے انسان بن گئے، ایک روز یہ بھی بندر نہیں رہیں گے اور انسانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ یہ کیسی احمقانہ آس ہے! لیکن ہم بھی کیا کریں، بندر جاتی کا دماغ ہی اس قدر چھوٹا ہے کہ اس میں کوئی بڑا خیال سما نہیں سکتا۔ آپ نے ہمارے سر تو دیکھے ہی ہیں ـــ چھوٹے چھوٹے ناریل۔ ایسے تنگ اور انھواں ماتھوں کے اندر کس قدر بائیو کیمیکلس آ سکتا ہے بھلا!"

پھر اس نے ایک زور کی ٹھنڈی سانس بھری اور بولا "ہمارا ارتقا نہیں ہونے کا۔ ہم نے بندر کے بندر ہی مر جانا ہے۔ بڑی اکثریت نے لیبارٹریوں کے اندر اور اکا دکا

بندروں نے قلندروں کے پیچھے — ہمارا کچھ نہیں بننا۔"

ہم باڑیاں جانے کے بجائے وہیں سے مری کو لوٹ آئے اور راستہ بھر ایک دوسرے سے بات کیے بغیر سنگل لائن میں چلتے رہے۔ وہ دھند جو آتی دفعہ کافی دبیز تھی، اب بالکل چھٹ چکی تھی اور بڑی تیز دھوپ نکل آئی تھی۔

پہاڑوں کی تیز اور چمکیلی دھوپ سال ہا سال کے تاریک غاروں اور ٹیڑھی میڑھی پوشیدہ گھپاؤں کو آن واحد میں روشن کر دیتی ہے۔ اس وقت کچھ ایسی رمزی اور سری روشنی اتر رہی تھی کہ ہمارے قریب سے گزرنے والا ہر شخص بامعنی ہو گیا تھا!

کوٹ ودو پاور ہاؤس

یوں تو اس کا براہ راست کوٹ ادو سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن ایک ہی زمین اور ایک ہی بحر میں ہونے کی وجہ سے جب بھی کوٹ ادو کا ذکر آتا، لوگ کوٹ ودو کی بات ضرور کرتے اور اس کا ذکر کرنا اب یوں بھی ضروری ہوگیا تھا کہ اتنی چھوٹی سی جگہ میں دیکھتے دیکھتے اتنا بڑا بجلی گھر قائم ہوگیا کہ جغرافیے کی کتابوں میں اس کا ذکر آنے لگا تھا اور یہ اتنا بڑا معرکہ اکیلے مسٹر رضوان نے مارا تھا۔ خیر وہ بھی کوئی خالی مسٹر رضوان نہیں تھا، انجینئرنگ یونیورسٹی کا گریجویٹ تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ شروع شروع میں اکیلا ضرور تھا لیکن بعد میں تو سارا گاؤں اس کے ساتھ شامل ہوگیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلا جنریٹر رضوان نے ڈیزائن کیا تھا مگر بعد میں تو گاؤں والے بھی کمزور میگنیٹک فیلڈ کا راز پا گئے۔

کوٹ ودو کے لوگوں کا خیال تھا کہ اگر صحیح طور پر طے شدہ اصولوں کے مطابق ڈائریکٹ کرنٹ جنریٹر کی بنا رکھی جائے تو یہ امدادی جنریٹر کے بغیر میگنیٹک فیلڈ کو انگیخت کرسکتا ہے۔

رضوان علی انجینئرنگ یونیورسٹی کا وہ گریجویٹ تھا جس کو سول انجینئرنگ میں ہائی سیکنڈ ڈویژن حاصل کرنے کے باوجود فوری طور پر نوکری نہ مل سکی تھی۔ رضوان کے والدین اور اس کی منگیتر اس تاخیر سے کچھ گھبرا سے گئے تھے اور اس کے ہونے والی سسرال نے شادی کی تاریخ ایک سال اور آگے کر دی تھی۔ رضوان البتہ اس بات پر خوش تھا کہ وہ قاعدے کے مطابق صرف ایک سال اور لگا کر الیکٹرک کی ڈگری بھی حاصل کرسکتا ہے۔

اصل میں اس کو ڈگری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ الیکٹرک سیمیکٹ کا بڑا جلوڑا تھا۔ چار سال تک اس نے پاپولر سائنس اور پاپولر میکنکس کا باقاعدگی سے مطالعہ کیا تھا اور ان دونوں رسالوں کی چھ چھ مہینے کی جلدیں بندھوا کر اپنی تفریح کا مسلسل سامان کر لیا تھا۔ اس کے ذہن میں تین کیڑے ایک ساتھ گھسے ہوئے تھے: ایک تو یہ کہ وہ برانڈرتھ روڈ اور آبکاری روڈ سے پرچون کا سودا خرید کر دنیا کا سب سے چھوٹا ایٹم بم بنا سکتا ہے۔

دوسرے وہ ایسا ایندھن تیار کر سکتا ہے جس کے زور پر ڈیڑھ کلو وزنی شارٹ ویو ٹرانسمٹر زمین کے آربٹ سے نکل کر کم از کم ایک سال تک اپنا سگنل زمین پر بھیج سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ مسلسل سال بھر تک کسی خوبصورت لڑکی کے والد کی بھینس چرا کر ٹلہ جوگیاں پر جا کے جوگ لے سکتا ہے اور دونوں کانوں میں مندرے پہن کر محبت کے پیچیدہ ترین راز سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔

رضوان کا ایمان تھا کہ کائنات کی چار پراسرار زمینوں میں سے ایک زمین پاکستان کا ٹلہ جوگیاں ہے، جو جہلم کے پاس اب نندنا کے نام سے موسوم ہے۔ نندنا کی چوٹی پر کھڑے ہوکر، آج سے ٹھیک ایک ہزار سال پہلے البیرونی نے زمین کے گھیر کی پیمائش کی اور پھر صدیاں گزرنے کے بعد اس ہیئت دان نے اسی جگہ کو گورو بالناتھ کے سامنے سیس نوا کر محبت کے آرکیچر کا جال بننے کے لیے چنا اور اپنے قصے سے آنے والی نسلوں کے دلوں کے لاٹو روشن کر دیے۔ رضوان کا خیال تھا کہ وہ اپنے ملک میں توانائی کے ایسے سرچشمے دریافت کر سکتا ہے جن پر ایک ٹکے کی بھی لاگت نہ آئے اور جن سے کروڑوں انسان اپنی روزمرہ کی ضرورتیں کچھ خرچ کیے بغیر پوری کرتے چلے جائیں۔

نہر کا ایس ڈی او ہونے کی بنا پر سب سے پہلے اس نے بہتے پانیوں اور گرتی جھلاروں پر کچھ تجربے کیے، لیکن پہلے سے کی گئی تحقیق پر وہ کچھ بھی اضافہ نہ کر سکا۔ پھر اس نے شمسی توانائی پر توجہ دینا شروع کر دی اور نہر کے بنگلے میں دور دور تک سولر سیلوں کے فیتوں سے مڑھے تختوں کی ایک دنیا آباد کر دی۔ اس نے ترکی اور سوہادہ

سے کوائس منگوا کر ان کے سلی کون سیل بھی بنائے اور انہیں تیز دھوپ میں رکھ کر شمسی توانائی کا انجذاب بھی کیا، لیکن ان کی توانائی ہندوستان اور اسرائیل میں کیے گئے تجربوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ پھر رضوان نے کھیوڑے سے گہرے بھورے رنگ کے نمک کے ڈلے منگوا کر "سلی کا" کی جگہ انہیں استعمال کیا۔ اس نمک سے بنے باریک قتلوں پر اس نے ایک طرف سنکھیا اور دوسری جانب نمک کا کھلا علاقہ چھوڑ کر جب برقی رو کو جانچ کر دیکھا تو اس کی قوت ایک چوتھائی یا ایک تہائی وولٹ سے زیادہ نہ تھی، یعنی اسی قدر جس قدر "سلی کا" سے بنے سیل سے حاصل ہوتی تھی البتہ اس کے ایمپیئرز میں ایک ایمپیئر کا اضافہ ضرور ہوا تھا۔

شمسی توانائی کو گرفت میں لینے کی منزل ابھی بہت دور تھی، لیکن رضوان کا پختہ ایمان تھا کہ قدرت کی گود میں توانائی کا ایک سرچشمہ ایسا بھی موجود ہے جس پر ابھی تک لوگوں کی توجہ نہیں گئی اور وہاں تک توجہ نہ پہنچنے کی سب سے بڑی مشکل ایک ہی تھی کہ سائنس کی دنیا کے لوگ اپنے بنائے ہوئے چوکھٹے سے باہر کسی متبادل سچائی کا یقین نہیں رکھتے اور طلسم خیال کے اور شعر شاعری کے دائرے والے لوگ قدرت کے بنیادی جوازوں کے علم سے ناآشنا تھے۔

لیکن رضوان کو یقین تھا کہ قدرت کے لامعلوم خزینہ علم کی وسیع مملکت سے ایک روز ایک چھوٹی سی حقیقت اس کی جھولی میں ضرور گرے گی.... مفت، بلامعاوضہ، بغیر مشقت اور بنا ہینڈل گھمائے۔ شرط صرف لگن کی، طلب کی، دید کی اور خواہش کی تھی۔ مسلسل منہ اٹھا کر، ہاتھ پھیلا کر اور دل ہی دل میں صدا دے کر — ہوکناک فقیرانہ صدا اور گرسناک عاشقانہ نگاہ!

اس نے ڈاک بنگلے کی آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر دوربین سے راجپلہ کے اس کمزور مقام کی طرف دیکھا جہاں پہلے بھی دو مرتبہ شگاف دے کر لوگوں نے اپنی زمین سیراب کر لی تھی اور اب بھی وہ تین چار دن سے عقابی نظر رکھنے والے ایس ڈی او کے دفع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس وقت رضوان کو اپنی دوربین میں درختوں کے جھنڈ تلے سر کاٹنے والا تو کوئی نظر نہ آیا البتہ کھیت کی پگڈنڈی پر بسنتی کپڑوں اور سرخ چنری میں ملبوس "چھتیس، چوبیس، چھتیس" کی شلوار جاتی دکھائی دی جس کے

ایک ہاتھ میں سٹین لیس کا ٹفن دان اور دوسرے میں ہرے پلاسٹک کا ٹھنڈے پانی کا جگ تھا۔

جب شاداں شریھ کے نیچے بیٹھے سلیمان کے سامنے پہنچی تو اس نے ٹفن دان ایک طرف اور جگ دوسری طرف رکھ کر سلیمان کی گود میں اتنے زور سے چھلانگ ماری کہ سلیمان زمین پر چاروں شانے چت جا گرا اور اس کا سر "ٹھا" کر کے پیچھے پڑے سہاگے سے جا ٹکرایا اور اس کے سر پر لپٹا ہوا تولیہ پھک کر کے کھل گیا۔

شاداں نے اس کی ٹھوڑی پر زور سے دندی کاٹ کر کہا "کھٹی امبی کھا جاؤں؟"

سلیمان کو ہنسی آ گئی اور اس نے مشکل سے اٹھتے ہوئے شاداں کے سر پر دھپا مار کر کہا "کچھ تو عقل کیا کر شاداں، پھر بھی ادھر ادھر کوئی دیکھ رہا ہوتا ہے۔"

شاداں نے اسی طرح گود میں بیٹھے بیٹھے کہا "ہم نے کوئی غیر شرعی کام کیا ہے جو کسی سے ڈریں!"

سلیمان سر جھٹک کر بولا "او جھلئے! غیر شرعی تو نہیں پر غیر اصولی ضرور ہے۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے!"

"اوے لوگوں کو کہنے دے سلیمان" شاداں نے اس کی چھاتی سے چمٹ کر اور کندھے پر ماتھا مارتے ہوئے کہا "لوگوں کی مانتے تو انہوں نے ابھی تک ہماری شادی نہیں ہونے دینی تھی۔"

سلیمان نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر ہاتھ بڑھا کر پلاسٹک کا جگ اٹھایا اور اس میں سے ایک گھونٹ بھر کر منہ میں چھک چھکایا اور پورا منہ ایک طرف موڑ کر کلی کی پچکاری پرے پھینکنا چاہی تو شاداں نے اپنا مہندی رنگا ہاتھ اس کے آگے کر دیا۔ کلی کا سارا پانی اس روک سے ایک تو دونوں کے قریب گرا، دوسرے اس کے چھینٹے لوٹ کر دونوں پر پھوار سی بن کے گرے۔

سلیمان نے زچ ہو کر کہا "تو بڑی بے وقوف ہے شاداں!" تو شاداں نے ہنس کر کہا "خالی بیوقوف ہی نہیں، بدھو بھی ہوں۔"

اب اس بات کا سلیمان کیا جواب دیتا۔ جگ زمین پر رکھ کر اپنی چھاتی سے چمٹے